© rasailojaraid.com

تحقیق و تصنیف نے صحیفۂ شاعری کو منسوخ کردیا۔ اور علمی و تحقیقی کارناموں کی آب و تاب میں ان کی شاعری ماند پڑ کر رہ گئی۔

سید صاحب کے دفتر کمال کی اس حیثیت کی جانب ابھی تک کسی نے خاطرخواہ اعتنا نہیں کیا ہے۔ غالباً سب سے پہلے ان کے خویش سید حسین نے معارف کے سلیمان نمبر میں "حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں سید صاحب کے صرف اس عہد کے کلام کا جلوہ دکھایا گیا ہے جب انھوں نے اپنی جبین نیاز آستانہ اشرفی پر جھکا دی تھی۔ اور ان کے جذبات و واردات قلبی شعر کے قالب میں ڈھل رہے تھے۔ اس کے بعد غلام محمد نے اپنے مرتبہ "ارمغان سلیمان" کے مقدمہ میں سید صاحب کی شاعری پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے۔ تیسرا اور غالباً آخری مضمون شاہ معین الدین احمد ندوی کا ہے جو رسالہ معارف جولائی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں نسبتاً وضاحت کے ساتھ سید صاحب کے مرتبۂ شاعری اور ان کے ذوق شعر و سخن کی تعیین و تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔

سید صاحب کے ذوق شعری کے محرکات
۱۔ بیت بازی سے شغف

سید صاحب کو صغر سنی میں بیت بازی سے بہت دلچسپی تھی۔ اور وہ اس میں پیش پیش رہتے تھے۔ شعر و شاعری سے ان کے ذوق کی بنیاد ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اسی بیت بازی سے پڑی۔ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی آج سے ساٹھ ستر برس پہلے بہار میں یہ عام دستور تھا کہ کسی گاؤں میں جب دوسرے گاؤں سے بارات آتی تھی۔ تو طرفین کے بچے عموماً شعر لڑایا کرتے تھے۔ اس علمی معرکہ کا نام اس زمانہ میں بیتبا بحث" تھا۔ بارات آنے سے چند ماہ پیشتر مکتب خانے کے بچے اس بیتبا بحث کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے۔ کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہو کر بیت بازی کرتے اور کبھی دو مکتبوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں کچھ کتابیں بھی اس سلسلہ میں مروج تھیں۔ جن سے اس معرکہ کو سر کرنے میں مدد ملتی تھی۔ ان ہی کتابوں کے اشعار لڑکے زبانی یاد کرتے تھے۔ ۱؎

۱؎۔ مناظر احسن گیلانی: سید الملت کی ہمہ گیر زندگی، مضمون، ماہنامہ ریاض کراچی سلیمان نمبر صـ۲۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے جن مکاتب میں حاصل کی ان میں بھی بیت بازی کا بڑا زور تھا، وہ ان میں نہ صرف پوری تیاری اور ذوق و شوق سے شریک ہوتے بلکہ اپنے گروہ کے امام و سرخیل بنائے جاتے تھے۔ سید ابوظفر ندوی لکھتے ہیں۔

"علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں بھی دو پارٹیاں تھیں، یہاں تک مجھے یاد ہے، ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور ان کے مشیر خاص حکیم نجم الہدیٰ ندوی تھے۔ اور دوسری کے مولوی قاسم۔۔۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہو گئے ۔ ؎"

بیت بازی کے سلسلہ میں سید صاحب نے ایک بیاض بھی تیار کی تھی جس میں بلا مبالغہ ہزاروں اشعار درج تھے۔ اس بیاض کے ایک جانب عربی اور دوسری جانب اردو اشعار تھے۔ چونکہ بیت بازی میں حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے اس لئے سید صاحب کو تقطیع کی طرف بھی خاص توجہ کرنا پڑی۔ اور اس کے باعث ان کو فن عروض پر اس قدر عبور حاصل ہو گیا تھا کہ طبقہ علماء میں اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

۲۔ خانقاہ پھلواری شریف کی محافلِ قوالی | گاؤں کی مکتبی زندگی سے نکل کر وہ ۱۸۹۶ء میں مزید تحصیل علم کے لئے پھلواری شریف (پٹنہ) آئے، یہاں خانقاہ مجیبی میں قوالی کی محفلیں برابر ہوتی رہتی تھیں جس کے اثر سے پورے قصبہ میں شعر و سخن کا ذوق عام تھا ؎۔ مزید برآں پھلواری میں سید صاحب کا قیام جس کمرے میں تھا، اس کے پاس ہی ایک بزرگ مولوی عبداللہ رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی معشوق ایک پرگو شاعر تھے۔ ان کے کمرے میں ہر وقت شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ سید صاحب بھی بہت دلچسپی اور شوق سے اس مجلس میں شریک ہوتے۔ ان کو بیت بازیوں سے اس کا چسکا تو پہلے ہی پڑ چکا تھا۔ اب یہاں کی قوالی کی محفلوں میں شرکت اور اس ماحول نے ان کے شعر و سخن کو اور

؎ ابوظفر ندوی: بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۱۳۹

؎ شاہ معین الدین ندوی: حیات سلیمان ص ۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جلا عطاکی۔ وہ خود اپنے ایک ریڈیائی مضمون میں رقمطراز ہیں:۔

"یہاں (پھلواڑی شریف) خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی۔ اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعروشاعری کا چرچا تھا اور ہے۔ میں نے بھی اس فضا میں سانس لی۔ اور یہیں میں نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول "منصور موہنا" دیکھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ [۱] "

۳۔ ندوہ کا شعری ماحول بہار کی مختلف درسگاہوں میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد جب ۱۹۰۱ء میں سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ کے لئے لکھنؤ پہونچے تو گویا شعروسخن کے اصل گہوارے میں آگئے۔ خود ندوہ میں شعروشاعری کا بڑا چرچا تھا، طلبہ اکثر مشاعرہ کرتے تھے۔ جس میں رکن الدین دانا، تجمل حسین شاہجہانپوری، مصطفیٰ خاں ملیح آبادی، عبدالغفور شرر، سید عثمان گیلانی، ظہور احمد وحشی اور مولانا عبدالسلام ندوی شمیم (صاحب شعرالہند) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سید صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنا طرحی یا غیر طرحی کلام سناتے تھے [۲]۔ لکھنؤ کی اس شعر پرور فضا میں ان کی شاعری کا نشہ دو آتشہ ہوگیا اور ان کا ذوقِ سخنوری نکھر کر درجہ کمال کو پہونچ گیا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی رقمطراز ہیں:۔

"جس زمانے میں سید صاحب مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ لکھنؤ کی پوری فضا پر شاعری چھائی ہوئی تھی ... اس فضا نے سید صاحب کی شاعری کا نشہ تیز کر دیا اور وہ خود بھی شعر کہنے لگے۔ [۳] " سید ابو ظفر ندوی لکھتے ہیں:

"... اس زمانے کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلال، ریاض اور مضطر وغیرہ بقید حیات تھے۔ عشرت لکھنوی کا نام طلبہ میں زیادہ معروف تھا۔ "پیام یار" نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا۔ مرثیہ کی مجلسیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ علامہ موصوف ان میں شرکت کرتے کرتے خود بھی

---

[۱] ۔ سید سلیمان ندوی "جن سے میں متاثر ہوا" (مضمون) رسالہ معارف جولائی ۱۹۴۰ء

[۲] ۔ نجم الہدیٰ: "سید صاحب کی یاد میں" (مضمون) رسالہ معارف نومبر ۱۹۵۹ء ص ۳۴۳

[۳] ۔ معین الدین۔ ارمغان سلیمان معارف جولائی ۱۹۵۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شعر کہنے لگے۔ اور بالآخر ایک باکمال شاعر بن گئے۔"[۱]

اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ شام کے وقت سید صاحب کو ایک مشاعرے کی خبر ملی۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ غزل کہنے کی کوشش کی اور صرف ایک ہی شعر موزوں کر پائے تھے کہ احباب آگئے اور ان کے ساتھ چل پڑے۔ اس زمانے میں وہ ڈاسن کا جوتا۔ علی گڑھ نما پاجامہ، کرتا یا کف دار قمیص اور ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ اور ہاتھ میں چھڑی لے کر باہر نکلتے تھے۔ اسی شان سے مشاعرہ میں پہنچ کر وہ بیٹھ گئے۔ ان کی صورت شکل اور لباس دیکھ کر شمع ان کے سامنے بھی آئی۔ پہلے تو بہت پریشان ہوئے۔ لیکن انتقالِ ذہن نے پریشانی دور کردی۔ اور حاضرین سے معذرت کی کہ مجھے مشاعرہ کی مطلق خبر نہ تھی ابھی احباب نے اطلاع دی۔ فوراً اٹھا اور چلا آیا۔ البتہ ایک شعر ذہن میں آیا ہے۔ وہ عرض کرتا ہوں[۲]

سر سے قدم تلک ہے رِدائے حیا پڑی   حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی

ظاہر ہے شعر لکھنؤ کے رنگ کا تھا، خوب خوب داد ملی۔ مولانا عبدالماجد رقمطراز ہیں :۔

"سید صاحب اپنا تخلص رمزی کرتے تھے۔ کبھی قطعہ اور کبھی رباعی کہتے اور تقریباً ہر بحر سخن میں شناوری کرلیتے۔ جون ۱۹۱۶ء میں جب ہیچمدان کا عقد ہوا ہے تو سید صاحب نے ازراہ محبت دیگانگت کئی کئی رباعیاں فی البدیہہ موزوں کردی تھیں۔ ایک ملاحظہ ہو۔

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد   نوشاہ بنے ہیں آج عبدالماجد

وہ روز سعید بھی خدا لائے جلد   بن جائیں گے جب کسی کے والد ماجد"[۳]

اکبر الٰہ آبادی نے سید صاحب کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا "کبھی کبھی دو چار شعر کہہ لیا کیجئے۔ آپ کو نظم سخن میں سلیقہ خاص ہے"[۴]

---

[۱] ابوظفر ندوی: "بچپن اور طالب علمی کے واقعات" معارف سلیمان نمبر ص۵۳
[۲] مصدر سابق۔ [۳] عبدالماجد دریابادی: نقوش سلیمانی (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص۲۳۱
[۴] محمد ظفر ہمایوں، رقعات اکبر ص۱۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کا کلام پختگی، شعریت، شستگی زبان اور فصاحت و بلاغت سے معمور ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ فطری شاعر نہ تھے۔ اور نہ ان کو شاعری سے فطرۃً مناسبت ہو ہی سکتی تھی۔ اس لئے کہ سید صاحب کی جبلت اور مزاج میں جو متانت و اعتدال، سکون و وقار اور حقیقت پسندی ودیعت تھی۔ وہ لوازم شاعری یعنی تخیل پسندی، مبالغہ آرائی، رنگینی و رعنائی اور جوش و خروش یا تبیت وغیرہ کے یکسر منافی تھی۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ سید صاحب کی نشو و نما کا عہد ہی شاعر گر تھا چنانچہ ماحول، تربیت اور شوقِ مطالعہ نے مل کر ان کے ذوقِ سخن کی تعمیر کی۔ اس کو سنوارا اور نکھارا [illegible] میں مولانا شبلی کے انتقال پر غم زدہ شاگرد نے جو طویل دلدوز مرثیہ لکھا، وہ جب "نوحۂ استاذ" کے عنوان سے شائع ہوا تو جہاں ڈاکٹر اقبال، اکبر الٰہ آبادی، عزیز لکھنوی اور حبیب الرحمٰن خان شیروانی جیسے ارباب اہلِ فن نے نوحہ گر کی سخنوری اور نوحہ سنجی کی داد دی، وہیں عماد الملک بلگرامی نے سید صاحب کو لکھا۔ "معاف کیجئے آپ شاعر نہیں ہیں"۔ سید صاحب اپنی وسیع النظری سے اس قول کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اس کے بعد انھوں نے ایک ایسا نکتہ مجھے بتایا جو میرے دل میں پیوست ہو گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ جب تک انسان کسی فن میں کامل نہ ہو جائے اس کو دوسروں کے سامنے عرض ہنر نہیں کرنا چاہیئے میں نے اسی دن بساطِ سخن لپیٹ دی۔ اور شاعری سے توبہ کر لی۔ اس کے بعد اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا۔ اور اگر چھپ نہ سکا چھپ گیا تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا[1]"۔

سید صاحب نے اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی اپنے کمالِ شاعری کے جوہر دکھلائے ہیں۔ چنانچہ [illegible] میں نواب محسن الملک کی ندوہ آمد کے موقع پر انھوں نے ان کی شان میں جو عربی قصیدہ لکھ کر سنایا، اس سے نہ صرف نواب موصوف بہت محظوظ ہوئے بلکہ مولانا شاہ سلیمان پھلواری نے اس کا ذکر اخبار میں کیا اور لکھا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان سرزمینِ ہند میں علم و دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا۔[2]

---

[1] سید سلیمان ندوی: "میں جن سے متاثر ہوا" (مضمون) معارف جولائی [illegible] ص [illegible]

[2] شاہ معین الدین ندوی: حیات سلیمان ص ۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امیر مینائی کے رنگ سخن کا تتبع | سید صاحب کا عہد لکھنؤ میں شعروسخن کی بہار کا زمانہ تھا۔ پوری فضا داغ، امیر اور جلال کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ سید صاحب امیر مینائی سے بہت متاثر تھے چنانچہ جب ندوہ میں طلبہ مشاعرہ کرتے تو جہاں اس میں بعض لڑکے داغ کی نقل کرتے، سید صاحب امیر مینائی کا روپ بھرتے۔ امیر کا دیوان مراۃ الغیب برابر ان کے مطالعہ میں رہتا تھا وہ اپنے اشعار میں اسی رنگ تغزل کا تجربہ اتارنے کی کوشش کرتے تھے۔ سید صاحب نے امیر مینائی سے اپنے تاثر کے آغاز کی وضاحت کرتے ہوئے خود لکھا ہے کہ: "میں نے جب آنکھ کھولی تو ملک میں امیر اور داغ کے معرکے تھے، میرے ایک استاد شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ جو جنرل عظیم الدین خاں کے زمانے میں رام پور میں رہے تھے اور وہاں منشی امیر مینائی کی صحبت برسوں اٹھائی تھی وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا کرتے تھے اور ان کے شعر سناتے تھے۔ ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانکپوری کے بڑے صاحبزادے مولوی صدیق میرے ساتھ دارالعلوم ندوہ میں پڑھتے تھے۔ ان کے ذریعہ امیر مرحوم کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گزریں اور دل میں امیر مینائی کی قدر و منزلت نے گھر کر لیا [1]"

سید صاحب کو امیر مینائی کے سیکڑوں منتخب و پسندیدہ اشعار نوک زبان تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی امیر کے ماہر فن ہونے اور تحقیق لغت و زبان کے تو معترف تھے، لیکن ان کی غزل گوئی کے زیادہ قائل نہ تھے۔ مگر سید صاحب کی زبان سے امیر کے منتخب اشعار سن کر ان کو اپنی رائے میں تبدیلی کرنی پڑی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اپنا اور سید صاحب کا ایک دلچسپ مکالمہ نقل کیا ہے، اور پھر اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سید صاحب سے ربط و رسم ایک مدت سے قائم تھا۔ ان کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کیا خبر تھی کہ الندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کے طوفانوں میں چمکانے والا کلام امیر کا حافظ نکلے گا۔ مراۃ الغیب کا آئینہ دار، صنم خانہ عشق کا پرستار۔ یہ پہلی بار کھلا کہ حضرت باایں زہد و تقویٰ اردو شعر و سخن کے رسیا ہیں اور اردو غزل و تشبیب کے متوالے [2]"

[1] سید سلیمان ندوی: "میں جن سے متاثر ہوا" (مضمون) معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۱۱

[2] عبدالماجد دریابادی: "نقوش سلیمانی" (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی باعث سید صاحب کے ابتدائی دور کے کلام پر امیر مینائی کے رنگِ سخن کے بہت نمایاں اور گہرے اثرات ملتے ہیں۔ وہی کلام کی ندرت، تازگی اور لطافت اور وہی حسنِ زبان نزاکت اور لوچ جو امیر کے امتیازی خصائص شعری شمار ہوتے ہیں، سید صاحب کی ابتدائی دور کی غزلوں میں درجۂ کمال پر ملتا ہے۔

امیر مینائی کی پُر گوئی اور قادر الکلامی پر تو تمام نقاد متفق ہیں۔ لیکن ان کا رنگِ سخن کا فی متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ کہنا زیادتی کی بات ہے کہ ناسخ اور داغ کے رنگ کی بے جا تقلید کے باعث امیر کی اپنی انفرادیت اُبھر نہ سکی ؎۱۔ اسی طرح یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ امیر کا پہلا دیوان "مرآۃ الغیب" خالص ناسخ و اسیر کے رنگ میں ہے ؎۲۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہر رنگ کے شعر موجود ہیں۔ بحیثیت مجموعی امیر کی غزل گوئی پر لکھنؤ اسکول کی روایات کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں لکھنویت کے دائرہ میں رہ کر انھوں نے اپنے کلام میں ندرت، تازگی اور لطافت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی، وہاں ان کے فن نے ارتقا کی منزلیں طے کر کے اپنی انفرادیت کا پرچم بھی لہرایا ہے ؎۳۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مرآۃ الغیب کے بارے میں، جس کے رنگ سے سید صاحب متاثر تھے، لکھتے ہیں:

"مرآۃ الغیب میں رعایت لفظی اور صنعت گری کے وہ نمونے موجود نہیں ہیں جو ناسخ اور آتش کے شاگردوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ بعض اشعار میں خارجی رنگ موجود ہے۔ لیکن بالعموم امیر نے جذبات نگاری کی طرف توجہ دی ہے ؎۴۔"

۱۹۱۲ء میں جب علامہ شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی تو سید صاحب نے اس میں بھی

؎۱ احمر لاری حسرت موہانی، حیات و کارنامے ص ۳۱

؎۲ احسن اللہ ثاقب : مکاتیب امیر مینائی (مقدمہ) ص ۲۰

؎۳ ابو محمد سحر : مطالعہ امیر ص ۱۴۴

؎۴ ابو اللیث صدیقی لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۵۹۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استاد کے اتباع کا حق ادا کیا اور علامہ شبلی کی رحلت کے بعد متعدد نظمیں ہو بہو شبلوی رنگ میں لکھیں۔ اور اہل فن سے استاذ کی ہم رنگی پر داد پائی۔ چنانچہ "نوحۂ استاذ" کے بارے میں نواب عماد الملک نے انھیں لکھا:۔ "آپ کی نظمیں علامہ شبلی کی یاد تازہ کرتی ہیں۔"[1]

ارمغانِ سلیمان | جس طرح سید صاحب کے علمی و تحقیقی فضل و کمال کے سامنے ان کی شاعرانہ حیثیت گم ہو کر رہ گئی، اسی طرح ایک عرصہ دراز تک ان کے شعری جواہر ریزے بھی پردۂ گمنامی میں مستور رہے۔ عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۵۵ء میں مجلہ معارف کے سلیمان نمبر میں سید صاحب کی شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"سید صاحب کی شاعری پر تبصرہ کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے۔ اور یہ منزل تو پھر بعد کی ہے۔ پہلے کوئی شاگرد ذرا تلاش و تفحص سے کام لے کر ان کا سارا کلام یکجا تو کرے۔"[2]

مقامِ مسرت ہے کہ اس تحریر کے ٹھیک دس سال کے بعد سید صاحب کے ایک مسترشد غلام محمد نے جولائی ۱۹۶۶ء میں کراچی سے ارمغانِ سلیمان کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام مرتب کر کے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ متوسط تقطیع کے ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس میں سید صاحب کے شاعرانہ مرتبہ کو نمایاں و متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مرتب کو اعتراف ہے کہ:۔ "یہ مجموعہ سید صاحب کی مشقِ سخن کا پورا سرمایہ نہیں بلکہ ان کی قلمی بیاض کی پوری پوری نقل ہے۔ اگر اضافہ ہے تو چند ایک قطعات یا ان نظموں کا جو کہیں اور چھپی ہوئی مل گئیں۔"[3] ارمغانِ سلیمان میں دورِ آخر (جو روحانی شاعری پر مشتمل ہے) کا کل خزانہ محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن دورِ اول کی قدیم ترین غزل اس مجموعہ میں ۱۹۰۱ء کی ملتی ہے۔ جبکہ گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ سید صاحب نے پھلواری شریف کے زمانہ قیام (۱۸۹۹ء) ہی سے طرحی اور غیر طرحی مشقِ سخن شروع

---

[1] غلام محمد : ارمغانِ سلیمان (مقدمہ) ص ۶

[2] عبدالماجد دریابادی : نقوشِ سلیمانی (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۲

[3] غلام محمد : ارمغانِ سلیمان، مقدمہ ص ۱۱

© rasailojaraid.com

کردی تھی۔ اس زمانے کے کلام کا سراغ نہیں ملتا۔ مولوی غلام محمد نے لکھا ہے :۔

"دورِ اول کے ذخیرے کے متعلق یقین نہیں آتا کہ شعر و سخن کی گرم بازاری اور سخن سنج جوانِ عمری کا حاصل صرف اتنا ہی ہوگا۔ ممکن ہے خاصا حصہ محفوظ نہ رہ سکا ہو۔ اس گمان کو تقویت یوں بھی ملتی ہے کہ اس مجموعہ میں ایک غزل بھی ایسی نہیں ملتی جس میں کہیں تخلص بھی آیا ہو[1]۔ ایسا قیاس ہوتا ہے کہ جس قلمی بیاض سے یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی کوئی اور بیاض سید صاحب کے پاس رہی ہوگی۔ جو مرورِ زمانہ سے معدوم ہوگئی۔ یا سید صاحب ہی نے بعد میں ایسے کلام کو جو خالص لکھنوی رنگِ تغزل کا آئینہ دار تھا، ثقاہت و متانت کے منافی خیال کرکے تلف کردیا ہو۔ بہرحال سید صاحب کا جتنا کچھ بھی کلام ذوق شناسانِ ادب کے سامنے ہے۔ وہ ان کے ذوقِ شعری اور مرتبۂ سخنوری کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے۔"

ارمغان کے فاضل مرتب نے اپنے "حسنِ ذوق" اور "پاسِ ادب کے تقاضے" سے دورِ آخر کے کلام کو پہلے اور دورِ اول کے کلام کو بعد میں درج کیا ہے۔

سید صاحب کے تخلص کی بحث سید صاحب کے تخلص کا معاملہ بھی بڑا اہم ہے۔ عبدالماجد دریابادی نے "رمزی" تخلص لکھا ہے۔ موصوف اپنے اس خیال میں بالکل منفرد ہیں۔ غالباً مولوی غلام محمد نے بھی ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"علامہ کے رفقاء کا کہنا ہے کہ وہ رمزی کے تخلص سے غزلیں کہا کرتے تھے"

راقم سطور کے خیال میں سید سلیمان ندوی کا کوئی تخلص نہیں تھا۔ عبدالماجد صاحب کا "رمزی" تخلص قرار دینا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ سید صاحب اپنا بعض کلام معارف میں شائع کرتے تو اس کے نیچے واوین میں "رمزی" لکھا کرتے تھے۔ مثلاً نظم "متاعِ حق گوئی کی بازار جہاں میں ارزانی" (معارف فروری ۱۹۱۶ء) اور "درسِ مساوات" (معارف اگست ۱۹۱۸ء کے

---

[1] غلام محمد : ارمغانِ سلیمان (مقدمہ) ص ۱۲

© rasailojaraid.com

آخر میں بائیں جانب "رمزی" لکھا ملتا ہے۔ اسی طرح اکتوبر ۱۹۱۶ء کے معارف میں "رمزیات" کے عنوان سے کچھ اشعار درج ہیں اور اس کے نیچے بھی "رمزی" تحریر ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا گیا کہ شاید سید صاحب کا تخلص یہی ہے۔ حالانکہ اس لفظ کو انھوں نے محض "سخن کا پردہ" بنایا ہے جیساکہ سید صاحب خود ہی لکھتے ہیں:۔

"اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا۔ اگر چھپ نہ سکا چھپ گیا تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا[1]" شاہ معین الدین ندوی رقمطراز ہیں:

"وہ ایک عرصہ تک محض تفنن طبع کے طور پر شاعری کرتے تھے اور اس کو انھوں نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس لئے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ اور جو غزلیں و نظمیں شائع کیں۔ وہ "رمزی" کے پردے میں ہیں[2]"

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ نواب عماد الملک کی تنبیہ سے پہلے سید صاحب اپنے اشعار میں تخلص استعمال کرتے تھے اور بعد میں اسے ترک کر دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو پیش نظر مجموعہ میں ۱۹۱۵ء سے پہلے کی جو تین غزلیں شامل ہیں، اس میں رمزی تخلص مذکور ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ نواب صاحب موصوف کی تنبیہ تو "نوحۂ استاد" (۱۹۱۵ء) کی اشاعت پر عمل میں آئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رمزی محض ایک مفروضہ تخلص ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف ایک چلمن تھی جس کے پیچھے سید صاحب خود کو چھپانے کی کوشش ضرور کرتے تھے مگر اہل نظر کی نگاہوں سے مستور نہ رہ پاتے تھے۔

سید صاحب کی شاعری کے مختلف ادوار

سید صاحب کے پیش نظر مجموعۂ کلام میں قدیم ترین اشعار ۱۹۰۰ء کے ہیں اور مؤخر ترین اشعار ۱۹۴۹ء کے۔ اس طرح ان کی شاعری کی مدت تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں ان کی شاعری کا سوتا دوسرے ہم عصر باقاعدہ شعراء مثلاً حسرت موہانی فانی، اصغر، اور جگر کی طرح بلا انقطاع مدت مسلسل جاری نہیں رہا۔ بلکہ درمیان درمیان میں اس کی

---

[1] سید سلیمان :۔ میں جن سے متاثر ہوا" (مضمون) معارف جولائی ۱۹۵۰ء

[2] شاہ معین الدین ندوی ؛ ارمغان سلیمان (مضمون) معارف جولائی ۱۹۷۰ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خشکی کے وقفے بھی آتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں شعر گوئی سے طبیعت بالکل ہٹ گئی تھی صرف مولانا تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد سے ان کی رحلت تک کے درمیانی مختصر زمانے میں سید صاحب کے جذبات اور وارداتِ قلبی میں جو جوش اور ابال پیدا ہوا۔ اس کے نتیجہ میں ایک وافر سرمایۂ شاعری وجود میں آگیا۔ جو باقی عہد کے ذخیرۂ سخن پر کمیت اور کیفیت دونوں حیثیت سے فوقیت رکھتا ہے۔ اسی لئے ارمغان سلیمان کے مرتب نے سید صاحب کے کلام کو دو[1] ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دور اول میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۲ء تک کا کلام شامل ہے۔ اور دور آخر کا کلام اپریل ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۵۱ء تک مشتمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے رنگ سخن اور ذوق شعری کے تدریجی ارتقا کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کو تین ادوار میں منقسم کرنا چاہیئے۔

پہلا دور۔ مشقِ سخن کا زمانہ پہلا دور زمانہ طالب علمی کی مشق سخن پر مشتمل ہے۔ اس دور کو ان کا تربیتی دور کہا جاسکتا ہے۔ جب سید صاحب لکھنوی رنگ تغزل کے دلدادہ اور امیر مینائی کے مرآۃ الغیب کے پرستار تھے۔ اسی کی کامیاب نقالی اور اتباع و تقلید میں ساری طباعی صرف کرتے۔ چنانچہ ان کے ابتدائی عہد کا کلام بھی اسی رنگ و آہنگ کا مکمل نمونہ ہے۔ زبان و بیان کی سلاست و صفائی کے ساتھ اشعار میں نزاکت اور لوچ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں لکھنوی دبستان سخن کا طغرائے امتیاز یعنی خارجیت کا میلان اور رنگینی، شوخی اور رعنائی خیال کی خصوصیات اس پر مستزاد تھیں۔ اس عہد کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

دستِ نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری
بعد مرنے کے ٹھکانے لگی محنت میری۔

چین سے بیٹھنے دیگی نہیں ہم دونوں کو
تجھ کو یہ شوخی تیری، مجھ کو یہ وحشت میری

چاہے تم آج نہ ہو میری وفا کے قائل
پر تمہیں یاد کبھی آئے گی الفت میری

---

[1] سید صاحب کی بیاض میں بھی صرف دو ادوار میں سارا کلام منقسم ہے۔ ایک پر وہ خود ہی اپنے قلم سے "رسمی و نقلی شاعری" اور دوسرے پر "روحانی شاعری" کا عنوان لگا گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے | اب تک ہمارے دل کو وہ تڑپائے جاتے ہیں
پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار | اب کیوں شبِ وصال وہ شرمائے جاتے ہیں

ادھر گلچیں خفا ہے اور ادھر بیتاب ہے بجلی | خدا حافظ ہے اے بلبل ترے اب آشیانے کا
اڑا لیتے ہو دل تم عاشقوں کا باتوں باتوں میں | نیا انداز یہ سیکھا ہے تم نے دل اڑانے کا

دوسرا دور، پختگی کا زمانہ | سید صاحب کی شاعری کا دوسرا دور قیام دارالمصنفین (۱۹۱۴ء) کے بعد سے شروع ہوا اور مولانا اشرف علی تھانوی کی ارادت یعنی ۱۹۴۲ء تک قائم رہا۔ اس دور کے کلام میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ اب ان کی شاعری محض گل و بلبل اور ہجر و وصال کی داستان نہیں رہ گئی۔ بلکہ ان کے جذبات میں لطافت اور خیالات میں معنویت اور گہرائی پیدا ہو گئی۔

سید صاحب نے ۱۹۱۶ء میں ایک غزل اعظم گڈھ کے کسی مشاعرے کے لئے کہی تھی جس کا مطلع ہے ؎

عجیب طرح کا ایک پیچ گفتگو میں ہے | دگر نہ "میں" میں وہی بات ہے جو "تو" میں ہے

یہ غزل جب ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گزری تو انھوں نے سید صاحب کو اس کی داد دیتے ہوئے لکھا "آپ کی غزل لاجواب ہے۔ بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں | وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے" [۱]

اس غزل کا درجِ ذیل شعر بیت الغزل کہلانے کا مستحق ہے ؎

دھن میں تیغ کے ہے اب بھی تشنگی باقی | عجیب لذت پنہاں مرے لہو میں ہے

اسی غزل کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

---

[۱] شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ حصہ اول ص۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں پتہ جو مل نہ سکا تیری جستجو میں ہے
خطاب غیر میں گو لاکھ احترام رہے مگر وہ لطف کہاں ہے جو لفظ "تو" میں ہے
نگاہِ لطف ادھر ہو کر آچلا ہے کیف بچا نہ رکھ میرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے

جون ۱۹۱۶ء میں مولانا محمد علی جوہر نے ایک غزل عبدالماجد دریابادی کو جیل سے لکھ کر بھیجی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ۔

ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ

اس غزل سے متاثر ہو کر اس کے تتبع میں مولانا دریابادی اور سید صاحب دونوں نے پڑی مرصع غزلیں کہہ ڈالیں۔ سید صاحب کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

تشہیر کا باعث نہ ہو دامانِ قبا دیکھ لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ
یہ عالمِ امکاں ہے تماشا گہ قدرت جو کچھ یہاں دکھلائے تجھے دستِ قضا دیکھ
تاثیرِ وفا دعویٔ باطل ہے سراسر اب شوخِ ستمگار یہ کچھ کر کے جفا دیکھ
بیکار ہے دشوارِیِ منزل کی شکایت بے راہ روی خضرِ رہ نما دیکھ
انکار تھا تجھ کو مری تاثیرِ دعا سے اب میری طرف دیکھ تو تاثیرِ دعا دیکھ
نکلے گا وہ خورشیدِ جمال آج ادھر سے اڑ جائیں مری خاک کے ذرے نہ صبا دیکھ
مقبول ہوا ہے یوسفِ زنداں کا تحفہ لایا ہے جو پیغامبرِ شہرِ سبا دیکھ

اگست ۱۹۲۰ء میں سید صاحب نے ایک نظم نما غزل "راز درون پردہ" کے عنوان سے کہی ہے جو خیالات کی رفعت اور پاکیزگی سے بھری ہوئی ہے۔ اس زمانے میں جب وہ کہیں سفر پر جاتے اور ٹرین پر سوار ہوتے تو ان کے ذوقِ شعری کے دبے ہوئے جذبات ابھر آتے اور وہ اپنی بیاض نکال کر اس میں اشعار قلمبند کرتے جاتے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ اسی طرح دورانِ سفر میں وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ "راز درون پردہ" مظفر پور کے سفر کے دوران کہی گئی۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں ۔

یہ کیسی بیکسی ضبطِ محبت کی الٰہی ہے کہ اس کا نام بھی میری زباں تک آ نہیں سکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمہیں کو کس طرح میری محبت کا یقیں آئے
قسم تک تو تمہارے نام کی میں کھا نہیں سکتا

نہ ہمدم کوئی ہو سکتا نہ مونس کوئی ممکن ہے
کہ لب تک ایک حرف اس داستاں کا آ نہیں سکتا

لبِ خاموش بھی بیگانہ ہے رازِ دروں سے
کوئی حرف اس تمنا کا لبوں تک آ نہیں سکتا

بمشکل نافہ اس کو بند کر کے دل میں رہنا ہے
میں اس بوئے محبت کو کہیں پھیلا نہیں سکتا

نظر اپنی سرِ بزم اس کی جانب اٹھ نہیں سکتی
کہ اسرارِ دروں میں یوں بتلا نہیں سکتا

جو تنہائی بھی حاصل ہو تو لب کچھ کہہ نہیں سکتے
کہ صورت دل کی خلوت میں بھی میں کھلا نہیں سکتا

اس اخفائے محبت میں جو لطف روح پرور ہے
کسی صورت سے وہ ضبطِ بیاں میں آ نہیں سکتا

یہ ہم دونوں سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں سمجھتے ہیں
کہ جو رازِ دروں ہے کوئی اس کو پا نہیں سکتا

اس کے بعد ۱۹۳۵ء تک سید صاحب کی کل اٹھارہ غزلیں ملتی ہیں۔ جو تقریباً سب کی سب سفر کے دوران کہی گئی ہیں۔ ان غزلوں کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں :۔

عقل کہتی ہے کہ ناداں نہ ہو گمراہ نہ ہو
عشق کہتا ہے کہ کیا لطف اگر چاہ نہ ہو

سوزشِ عام ہو تب آگ سے اٹھتا ہے دھواں
عشقِ کامل کا جو دعویٰ ہے تو پھر آہ نہ ہو

حرفِ مطلب کہا نہیں جاتا
بے کہے بھی رہا نہیں جاتا

نگہ لطف سے نہ دیکھ مجھے
یہ ستم بھی سہا نہیں جاتا

عشق کی تازگی ہے آنسو سے
بے سبب تو بہا نہیں جاتا

نازک بہت ہے عشق و محبت کا آئینہ
سایہ پڑے بھی غیر کا اس پر تو ٹوٹ جائے

یہ آبگینے مجھ کو نہایت عزیز ہیں
اے خارِ دشت آبلہ کوئی نہ پھوٹ جائے

یہ کیسی آگ ہے سینہ میں دب دب کر سلگتی ہے
ذرا دامن سے دی تم نے ہوا اور دل میں لگتی ہے

نہ بجھ جانے کی رخصت ہے نہ جل جانے کی ہمت ہے
سلگ کر پھر وہ بجھتی ہے، وہ بجھ کر پھر سلگتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ دل وہ شیشۂ نازک ہے میرے سینے میں — نظر سے بھی جو گرے پاش پاش ہو جائے
کہاں شوق خدا دیکھو بھلا کر اُٹھے — چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہو جائے
شکستِ رونقِ بت خانہ ہو نہیں سکتی — خلیل اگر خود ہی بت تراش ہو جائے

اظہار جذبِ عشق پہ مائل تو ہو گئے — تیرا اثر کہ آج وہ گھائل تو ہو گئے
مضطر وہ برق وش تھا اُٹھنے کو خود حجاب — ہم آپ درمیان میں حائل تو ہو گئے

میرے انوارِ تجلی سے فضا پُر نور ہے — میں جو ہوں مسرور تو سارا جہاں مسرور ہے
وہم سے بڑھ کر نہیں ہے فرق جبر و اختیار — غور سے دیکھو کہ جو مختار ہے مجبور ہے

دعویٰ غلط ہے عشق کی تمکین و ہوش کا — ممکن نہیں ہے حسن سے ہو بے نیاز عشق
کتنی ہو مختصر یہ کہانی حیات کی — کھلے اگر نہ حُسن کی زُلف دراز عشق

لکھنوی رنگ | مذکورہ بالا اشعار سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرورِ ایام سے گو سید صاحب کے خیالات میں رفعت، جذبات میں شدت اور زبان و بندش میں صفائی اور پختگی پیدا ہوتی گئی۔ لیکن بنیادی طور پر سید صاحب اب بھی اس رنگ و آہنگ سے ہم رنگ رہے، جسے شعر و ادب کی تاریخ میں "لکھنویت" کا نام دیا جاتا ہے۔ فنی اعتبار سے ہم ان اشعار کو معیاری قرار دے سکتے ہیں، لیکن اس کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شاعری کا خواہ پہلا دور ہو یا دوسرا، دونوں کی مشقِ سخن تمام تر تفریحی اور روایتی ہے۔ اور وہ خود بھی اس کو "رسمی و نقلی" شاعری کا نام دیتے ہیں۔ امیر مینائی کے گہرے اثرات کے باعث وہ کلی طور پر "لکھنویت" سے اپنا دامن دوسرے دور میں بھی نہ چھڑا سکے جس ابتذال، سطحیت، خارجیت و معاملہ بندی بعد حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شوخی و رنگینی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باعث لکھنوی اسکول کے شعرا خورد و نقد و جرح بنے، اس کے نشانات سے بایں زہد و تقوی سید صاحب کا کلام بھی خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کل شب مرے نہ آنے سے خفگی بجا سہی
ہے کیوں نگاہِ ناز مگر شرمسار آج

دستِ گستاخ کو اجازت دو
منہ سے کھل کر کہا نہیں جاتا

ہماری پاکبازی کی سند پر مُہر ہوتی ہے
مجھے جب بوسۂ لب سے کبھی وہ شاد کرتے ہیں

وہ رفتہ رفتہ اور بھی دیں گے اجازتیں
ان کے گلے میں ہاتھ حمائل تو ہو گئے

گیسو سنگھا کے ہوش میں کیوں لا رہا ہے تو
یوں ہی تو بے خود کیے مجھے اے یار چھوڑ دے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام اشعار قطعی تقلیدی اور روایتی طور پر کہے گئے ہیں شاعر کے اصل مزاج کے آئینہ دار ہرگز نہیں۔ بقول غلام محمد "وہ ایک سراسر دینی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور خود ان کا شخصی "شاکلہ" تمام تر دینی رنگ قبول کیے ہوئے تھا۔ اس لئے اس زمانے میں جو کچھ مشقِ سخن کی وہ (بجز ایک نعت اور دو نوحوں کے) محض رواج اور ماحول کی مطابقت کے لئے تھی۔" چنانچہ ان روایتی اور تقلیدی غزلوں میں بھی سید صاحب کے بنیادی مزاج کی جھلکیاں کہیں کہیں بہت صاف دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً اس شعر میں خدا ترسی کی جھلک :-

لب پہ ہے نامِ خدا دل میں ہے سودائے صنم
مجھ کو اتنا کر کسے دیکھتا اللہ نہ ہو

اسی طرح درج ذیل اشعار میں ان کے اصل مزاج اور مصنوعی مذاق میں کس طرح کشمکش و اضطراب

(باقی صفحہ ۲۰۶ پر)

© rasailojaraid.com